کونسی ایسی بات ہوئی ہے

اکرم اعوان

فہرست

-1	اک نئی فکر	منیر نیازی	
-2	دیباچہ	علی اکبر منصور	
-3	نعت		19
-4	سلام		21
-5	آج کسی سے بات ہوئی ہے		23
-6	فکر دنیا میں چھپے رہتے ہیں تیرے دُکھ بھی		26
-7	ترے دِل کی چٹانوں سے نہ پھر ؟		28
-8	عشق کو رکھنا ہے گر زندہ تجھے		30
-9	کھول کر بالوں کو رکھ		33
-10	اِک میں کہ دشت ہجر میں مدت سے خیمہ زن		35
-11	یہ بارش یہ بادل بوندیں کیوں پردیس میں آتی ہیں		37
-12	تنہائی جب سارے گھر میں خود کو بونے لگتی ہے		39
-13	تصور میں دیکھوں ملاقات کرلوں		41

14- کل کی باتیں کل کر لیں گے 43

15- چلنا تھی جو رقیب سے وہ چال چل گئے 45

16- چاروں طرف اندھیرا ہے 47

17- نہ مل مجھ سے نہ الفت کا صلہ دے 50

18- اب تو ملے ہوئے بڑی مدت گذر گئی 53

19- بیتے ہوئے لمحات نہیں آتے پلٹ کر 55

20- ہے زلف گرہ گیر بھی اک قید کا ساماں 57

21- اے ساکنان قریہ دل آؤ تو سہی 59

22- شب کے پر ہول سے سناٹوں سے جاں جاتی ہے 62

23- یہ کس طرح کا ہجر ہے' کیسا وصال ہے ؟ 64

24- کیا ہم نے کچھ بھی برا نہیں' ہوئی تم سے کوئی خطا نہیں 67

25- اے دِل کبھی مجھ سے بھی کچھ بات کیا کرنا 70

26- دھوکا ہی دے کے جاتی ہے اب اپنی روح تک 73

27- آئے تو تھے وہ ایک دن لیکن ہوئی عجیب بات 75

28- باتیں تو بہت تھیں کہنے کی اے کاش میں ساری کہہ پاتا 78

29- ہم کو حسن و عشق کا اب تک فسانہ یاد ہے 81

30- تری بے رخی کے باعث کوئی مکاں نہیں ہے 84

31- مانو جو میری بات تو اک بات کہوں گا 86

32- جس بات کا چرچا ہے سر بزم رقیباں 88

33- کیوں اس قصے کو چھیڑا ہے' کیوں رات کی بات سناتے ہو ؟ 90

34- ہم نے تو اپنے دل کو ترا گھر بنا دیا 92

-35	پھر سے خط لکھتا ہوں قاصد کے لئے	94
-36	درد ہوتا ہے کسے روتا ہے کون	96
-37	اکیلا ہوں تو کیا غم ہے اکیلی ہی تو دنیا ہے	98
-38	شب نم گزیدہ سے پوچھ لو دل زار وجہ قرار کو	100
-39	چھیڑو نہ سر بزم نکل جائے نہ منہ سے	102
-40	اِک تم ہو کہ فرصت نہیں اک لمحے کی تم کو	105
-41	صدیوں تک بادل جھومیں گے اور ہو گی برسات	107
-42	میں فقط تیرا ہوں تو یہ بھی ذرا سوچ آخر	111
-43	پھر آئی بہاراں ذرا مجنوں کو صدا دو	114
-44	دیکھا انہیں تو ایسے لگا جیسے آج	116
-45	مرنے والوں سے کوئی یہ بھی کہے	119
-46	ہم بہک جاتے جنوں میں کیا خبر	122
-47	کون پاگل ہے 'کیسا ہے پایا؟	124
-48	شب دراز کو آخر سحر بھی ہونا تھا	132
-49	الف کی تیری چھاؤں نے محفوظ کر دیا	134

ایک نئی فکر

امیر محمد اکرم اعوان کی شخصیت میں ایک عجیب سحر ہے ان کی موجودگی میں حاضر لوگوں کو ایک نئی طرح کی فکر اور بصیرت حاصل ہوتی ہے جو مروجہ افکار سے الگ اور بے حد پرکشش محسوس ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے مذہب اور عقل کو محض لباس کی طرح پہنا ہوا ہے اور خلقِ خدا کو دین اور علم نو سے خائف رکھنا جن کا پیشہ ہے امیر محمد اکرم اعوان کا عہد حاضر میں ہونا ایسے لوگوں اور ان کے پھیلائے ہوئے خیالات کی الجھنوں سے نجات کا سبب ہے۔

منیر نیازی

صوفی شاعر

مشرقی ادب میں تصوف کی شعری روایت ہی اتنی جاندار ہے جسے عالمی ادب کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ رومی' بلھے شاہ' بابا فرید' باھو اور شاہ لطیف جیسے صوفی تخلیق کاروں نے عالمگیر انسانی قدروں سے مزین شعری روایات کو جنم دیا۔ ان صوفیاء کی زندگی انتہائی متنوع' عمیق اور رنج والم کے حامل تجربات کا مرقع تھی۔ انکی زیست کا ہر لمحہ' انکی ہر سانس کربناک ریاضتوں سے وجود میں آئی۔ انکے اندر درد کی ایک وسیع کائنات دھڑکتی ہے جو ان کے باطن پر انفس و آفاق کے تمام تخلیقی در کھول دیتی ہے۔ اسی بنا پر ان کا کلام کسی مخصوص خطے اور وقت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی ان حدود سے ماورا ہوتا ہے اور عالمگیر انسانی معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی ذات' اپنی مٹی اور اردگرد کے انسانی ماحول سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اپنے غموں کو دوسرے انسانوں کی مسیحائی اور روحانی بالیدگی اور تضادات میں گھرے ہوئے انسانوں کی بے سمتی کو سمت دینے کے لئے عمل میں لاتے تھے۔ صوفی ایک باعمل تخلیق کار ہوتا ہے جو شعور و عمل کی اعلیٰ ترین سطح پر فائز ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اردو زبان میں ایسی متصوفانہ روایت کا وجود نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ اردو کی اساس میں کسی گہری معنوی اور علاقائی ثقافت یعنی مستحکم' مستقل ثقافت جیسی کہ پنجابی' سرائیکی اور سندھی کو عطا ہے' کا وجود ملنا مشکل ہے۔ اسی بنا پر اردو شاعری میں ابھی تک کسی عالمگیر روایت کا آغاز نہیں ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ ہم متصوفانہ شعری روایت سے کٹ گئے اور ایک عرصہ تک اسی خلا میں بھٹکتے رہے۔ ہماری تہذیب ایک ایسے کردار سے محروم ہو گئی جو صوفی' شاعر اور مسیحا کا کردار تھا چنانچہ انسان' تنہائی" اکلاپے' مغائرت اور تضادات کی صلیبوں پر جھولنے لگے۔ وہ اپنے سینے میں محبت ایمان اعتقاد کی بجائے ایک۔ بے سمت اور تاریک خلاء کے ہو گئے۔

فطرت کے قوانین میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب معاشروں' قوموں' تہذیبوں اور انسانی باطن میں خلاء در آئے اور بڑھتا ہی چلا جائے تو اسی خلاء سے کسی درخشاں ستارے کا ظہور ہوتا ہے جو کائنات کے انسانوں کے منتشر اجزا کو پھر سے جوڑ دیتا ہے۔

ہمارا ملک اور قوم دور حاضر میں اپنی تمام ملکی و قومی تاریخ میں ایک عذاب ناک انسانی بحران اور سماجی آشوب سے گزر رہے ہیں اور ہم تہذیبی زوال کے آخری کنارے پر پہنچے ہیں جہاں سے آگے اندھا خلاء ہے۔اسی عصر میں امیر محمد اکرم اعوان جیسی روحانی شخصیت کا ظہور لازماً فطرت کے فیصلوں کی طرح ہے۔ ملک صاحب کی تمام زندگی کٹھن ریاضت سے عبارت ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو اور تنوع کا تجربہ اپنی ذات میں سمویا ہے۔انہوں نے ترک دنیا کی روش یا بدھ کی ریاضت کا انداز نہیں اپنایا بلکہ انسانی رشتوں اور سماجی تغیرات کی چکی میں پس کر اور ہر مظہر زیست کو جذب کر کے ریاضت کی جوت جلائی ہے۔اس ریاضت نے انہیں ایسی بصیرت اور حکمت سے نوازا ہے جو دنیاوی اور ظاہری علوم سے ماوراء اور ارفع ہوتی ہے۔ یہ خود شناسی سے خدا شناسی کا سفر ہے۔اور ایک خاص متصوفانہ وجدان و آگہی کا زندہ ہونا ہے۔ملک صاحب کے ہاں دین و مذہب کا تصور محض نفسیاتی دفاع اور یکطرفہ سوچ کی طرح نہیں۔وہ کہیں بھی دین کو ایک سماجی و نفسیاتی آڑ کے طور پر نہیں لیتے بلکہ ان کے ہاں ایک خداداد' واضح اور عملی نقطہ نظر موجود ہے جس سے وہ زندگی کے تمام اداروں اور انسانوں کی تعبیر و تفہیم اور تطہیر کرتے ہیں۔

میرے نقطہ نظر کے مطابق زیست نے اولاً ملک صاحب کے باطن پر درد و الم کے دروازے کھولے۔انہوں نے ہر انسانی کرب کو اپنی اذیت کی طرح قریب سے دیکھا' محسوس کیا اور بھگتا ۔ہمارے نزدیک اسی درد کی کائنات کا انسان کے باطن میں افشا ہونا ہی تخلیقی عمل کی اساس ہے جو روحانیت' تخلیق اور انسانیت کے معراج کی طرف لے جاتی ہے۔ملک صاحب کی ساری بصیرت ان کی شخصی واردات عمیق مشاہدہ اور عملیت پسندی ہے۔اور یہی عناصر ان کی تخلیق شعر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ان کی شاعری تصوف کی شعری روایت کا ایک جدید ترین احیاء ہے جس میں انسانی ذات سے لے کر معاشرے اور انسانی تہذیب تک کو بالیدہ کرنے کی قوت موجود ہے۔چند اشعار دیکھئے :

جل گیا جب دل تو آئینہ بنا
ایک جیسے ہو گئے ہجر و وصال

کئی درد دریا ہیں جو زندگی میں
ہمیں غم کا ساگر بنا ڈالتے ہیں

طبیبوں کو سیماب کیا ہو گیا ہے
کہ مردے کے منہ میں دوا ڈالتے ہیں

اڑ رہا ہوں بادلوں سے بھی پرے
گرچہ میں اک طائر مجبور ہوں

ٹوٹ کر اشکوں کی لڑیاں جب گریں
ان کو سینے پر سجا لیتا ہوں میں

دوجہاں کی وسعتوں کو بعض وقت
اپنی بانہوں میں چھپا لیتا ہوں میں

بنس کے ملتا بھی ہوں لوگوں سے فقیر
چھپ کے آنسو بھی بہا لیتا ہوں میں

علی اکبر منصور

نعت

ملی ہیں خوبیاں انسان کو مدینے سے
چرائی پھول نے خوشبو وہاں پسینے سے

چمن میں فکر کی مثل بہار وہ آئے
سجی ہے رونقِ بزمِ جہاں قرینے سے

قبورِ جسم میں تھی دفن روحِ انسانی
نویدِ زندگی جاوداں مدینے سے

بچھڑ گئے تھے سبھی لوگ ذات سے اپنی
ملی شناخت یہ ربِ جہاں مدینے سے

تہی ہے ہادی برحق، تو رہبر صادق
دکھایا حاصل کون ومکاں مدینے سے

جو دشمنی تھی وہ کافور ہو گئی فوراً
ہوئیں محبتیں ساری رواں مدینے سے

کہاں کرے گا کوئی اب تلاش نعمت کو
کہ بانٹے جاتے ہیں دونوں جہاں مدینے سے

کہیں ٹھہرتا نہیں ہے جو چل نکلتا ہے
بھری بہار کا سیل رواں مدینے سے

درِ حبیب پہ سیماب کو تلاش تو کر
وہ اور جائے گا اٹھ کر کہاں مدینے سے

(17اپریل 1998ء مانسہرہ جامع مسجد حضرت عمار بن یاسرؓ)

سلام

میرا حسین سدا کربلا میں رہتا ہے
یزید دہر کا ہرگز کبھی غلام نہیں

مرا بھی نام ہے میں ہوں غلام آقاؑ کا
میں اُن کے زیر قدم ہوں میں بے مقام نہیں

اُنہیں کی راہ میں مرنا ہے آرزو میری
بچھڑ کے چلنے کا اب کوئی اہتمام نہیں

مرا ہے کام کہ آواز دوں سر مقتل
جھکوں میں ظلم کے آگے یہ میرا کام نہیں

تجھے خبر نہیں سیماب طرزِ دلداری
کہ اُن کے نام پہ مرنے میں کچھ کلام نہیں

(27 ستمبر 1998ء عبدالحکیم)

○

آج کسی سے بات ہوئی ہے
آدھی سی ملاقات ہوئی ہے

بارش بھی ہے تیز ہوا بھی
کیسی انوکھی رات ہوئی ہے

جیت کے خوش تھے ہم جو بازی
اِس بازی میں مات ہوئی ہے

دن تو دن ہے کٹ جاتا ہے
کاٹنا مشکل رات ہوئی ہے

اور کسی کا کیا بگڑے گا
ختم ہماری ذات ہوئی ہے

کہدو قاصد ہم سن لیں گے
جو بھی تم سے بات ہوئی ہے

قوسِ قزح کے رنگ ہیں بکھرے
کس کی کس سے بات ہوئی ہے

جگنو دِل بہلانے آئے
جنگل میں ہوں رات ہوئی ہے

رُوٹھے رہو پر اتنا بتا دو
کون سی ایسی بات ہوئی ہے

رات بہت سیماب کو سوچا
رات بہت برسات ہوئی ہے

(دارالعرفان منارہ 12 بجے شب)

○

فکر دنیا میں چھپے رہتے ہیں تیرے دُکھ بھی
ان سے نکلوں تو پریشان کیا کرتے ہیں

آرزو وصل کی ہو جائے تو ہے آب حیات
بعد مرنے کے بھی عشاق جیا کرتے ہیں

○

درد اور کرب ہی بنتے ہیں مداوا اِک دن
چاک دِل، تیر نگاہوں کے سیا کرتے ہیں

ہم ہی سادہ ہیں بنایا تھا وسیلہ جن کو
وہ بھلے لوگ تو خود پیار لیا کرتے ہیں

تیرے ہونٹوں نے چھوا تھا کبھی ساغر اپنا
ہم ابھی تک اُسی ساغر سے پیا کرتے ہیں

لاکھ روکیں بھی تو پھر آہ نکل جاتی ہے
تجھ سے بچھڑے ہیں تو مر مر کے جیا کرتے ہیں

تیری بانہوں میں جو سیماب نے جاں ہاری تھی
نالے بلبل کے وہی بات کیا کرتے ہیں

(2نومبر1997ء عبدالحکیم)

○

تیرے دِل کی چٹانوں سے نہ پھر برفیں پگھل پاتیں
محبت کے گلستاں میں نہ گل کھلتے نہ پھل آتا

کسی کے دِل کی نگری میں کوئی گوشہ تو خالی تھا
وگرنہ تو خفا ہو کر خیال اپنا نکل آتا

کسی کو آس ہے اب تک تمہاری بے وفائی سے
وگرنہ بھول کر سب کچھ کبھی تو وہ سنبھل جاتا

ابھی تک بے خبر ہے وصل کی لذت سے زندہ ہے
پہنچتا شمع کی لو تک اگر پروانہ جل جاتا

کہا لوگوں نے کافر ہے' بہت ہے سنگدل ظالم ۔
اگر دِل میں نہ تُو ہوتا تو اُن کا داؤ چل جاتا

ابھی سیماب کے دِل میں بچھڑ جانے کا خدشہ ہے
جو موت آتی تیرے در پر تو یہ کانٹا نکل جاتا

(4نومبر1997ء دارالعرفان)

○

عشق کو رکھنا ہے گر زندہ تجھے
تو صنم کو پھر صنم ہی رہنے دے

یوں تو شادی وصل کی صورت ہے ایک
عشق کو دیتی ہے لیکن یہ لپیٹ

دو الگ خانوں میں رہنے دے جُدا
ہے الگ بیوی کی محبوبہ کی راہ

عشق اور شادی ہیں دو شعبے الگ
یوں تو رہ سکتے ہیں جیسے دونوں لب

ہاں مگر دونوں کو سی سکتے نہیں
دونوں ہی مل جائیں جی سکتے نہیں

فکر شادی اور فکر روزگار
اس پہ بڑھ جاتا ہے پھر بچوں کا بار

روز جھگڑا اور کِلکِل صبح و شام
دال روٹی جوتی کپڑے کا سلام

عشق اِن جھگڑوں سے ہے یکسر بلند
ڈالتا ہے یہ ستاروں پر کمند

گر کرو شادی تو محبوبہ گئی
دیکھے ہیں انجام بد ایسے کئی

بے نیاز فکر فردا فکر عشق
ہجر میں رہتا ہے زندہ ذکر عشق

عمر بھر دیکھا تھا جو ہوتا رہا
بات دی سیماب نے اس کی بتا

(15نومبر1997ء P.K.301اسلام آباد سے کراچی جاتے ہوئے)

○

کھول کر بالوں کو رکھ پھر سے گھٹا آئی ہے آج
کیا کسی کو پھر سے ویرانے کا آیا ہے خیال

روشنی، رُت، پھول، بادل اس طرف چلنے لگیں
تیری راہوں میں لٹانے کو پھریں اپنا جمال

کٹ گئیں شیریں کی خاطر تیشہ فرہاد سے
کاٹنا اونچی چٹانوں کو بظاہر تھا محال

آنکھ نے دیکھا اسے جانے جگر کیوں شق ہوا
دل پہ کیوں بجلی گری کیوں لب کشائی ہے محال

سامنے اپنے تھے وہ پر دیکھنا ممکن نہ تھا
ان کی محفل میں یہ دیکھا دیدہ تر کا کمال

آہ کے بادل بنائے آنکھ سے برسات کی
دِل کی دُنیا میں بسایا ہم نے اک گلشن کمال

مدتوں سے رہ گذر پر ہیں مکیں سیماب جی
کاش اس رہ سے گزرنے کا انہیں آئے خیال

(18نومبر1997ء P.K. 368 کراچی سے اسلام آباد آتے ہوئے)

○

اِک میں کہ دشتِ ہجر میں مدت سے خیمہ زن
اِک وہ کہ جس کے دم سے چمن میں بہار ہے

پانا مرا اُسے کبھی ممکن نہیں مگر
اک بات ہے کہ ذہن پہ ہر دم سوار ہے

ظلم و جفا ہو مجھ پہ مگر تیرے ہاتھ سے
تیری تو ہر ادا سے مرے دِل کو پیار ہے

تہمت سے جس کے نام کی ہم کو ڈراتے ہو
اس پر تو اپنا قلب بھی' جاں بھی نثار ہے

دِل میں ہے آگ' آنکھ میں نم اور لب پہ چپ
اے کاش کوئی کہہ دے کہ یہ ہی تو پیار ہے

درد دِل حزیں سے ہی آنکھوں میں آب ہے
بنتی ہے آب اس سے یہ کیسا غبار ہے

تُم نے تو اپنا کہہ کے بھی ہم کو بھلا دیا
دِل میں تمہاری بات کا اب تک خمار ہے

دُنیا ادائے حق پہ ہی قائم ہے اے فقیر
وعدہ تمہاری دید کا کب سے اُدھار ہے

(2دسمبر1997گوجرانوالہ)

○

یہ بارش، یہ بادل، بوندیں کیوں پردیس میں آتی ہیں
کیا پردیس کی کلفت کم ہے یہ کیوں آگ لگاتی ہیں

رنج و غم تم کم کرنے کو ان کی باتیں یاد کرو
لیکن یادیں تو اس دُکھ کو پل پل اور بڑھاتی ہیں

لوگوں سے پوچھا کرتے ہیں اب وہ اپنی حالت کو
کچھ تو ہے جو ان کو اب تک اپنی باتیں بھاتی ہیں

سب ہی مسافر ہیں اس جگ میں راہوں میں بکھرے ہیں لوگ
لیکن کچھ لوگوں کی راہیں جانے کیوں مل جاتی ہیں

بستیاں بن کر اجڑ گئیں اور جھڑ گئے کچھ شاخوں سے پھول
پھر سے کوئی ہریالی لائے بستیاں پھر بس جاتی ہیں

کہتے تھے سیماب تھا کوئی درد سا بانٹا کرتا تھا
کیسے کیسے لوگوں کی بس یادیں ہی رہ جاتی ہیں

(11 دسمبر 1997ء بمبئی)

سیما غزل کے دو شعروں پر اس کی خاطر

تنہائی جب سارے گھر میں خود کو بونے لگتی ہے
میرے گھر کے دروازے پر دستک ہونے لگتی ہے

شام ڈھلے جب سارے پنچھی گھر کو جانے لگتے ہیں
سامنے والے پیڑ پہ بیٹھی چڑیا رونے لگتی ہے

آنکھ میں ساون بس جاتا ہے بوندیں ٹپ ٹپ گرتی ہیں
بیتے لمحوں کی شاموں کو آنکھ بھی دھونے لگتی ہے

کوئی تو ایسی بات بھی ہو گی جس پر وہ ناراض ہوئے
اپنی طبیعت بیتی یادوں میں پھر کھونے لگتی ہے

یاد بھی ایک پری ہو جیسے یوں برسوں کی سیر کرے
کچھ لمحوں کی چوکھٹ پر تو یہ بھی سونے لگتی ہے

باتیں کہہ دیں ساری غزل نے لوگو! عشق میں مت پڑنا
لیکن بیج یہ عشق کا دل میں پھر سے بونے لگتی ہے

(10 دسمبر 1997ء ڈی۔جی۔خان)

○

تصور میں دیکھوں ملاقات کر لوں
اگر ہو اجازت تو میں بات کر لوں

ڈروں گر نہ لوگوں کی قاتل زباں سے
بسر شہر میں تیرے اِک رات کر لوں

ٹپک کر بھگو دیں گے دامن تمہارا
وگرنہ میں اشکوں کی برسات کر لوں

اگر ایک لمحہ تجھے دیکھ پاؤں
وہی لمحہ دل کو میں سوغات کر لوں

دم واپسیں کہہ رہا تھا اجل سے
ذرا ٹھہر اُن سے میں اِک بات کر لوں

اگر تو یہاں مجھ سے ملنے نہ پائے
تو کیا اُس جہاں کی مناجات کر لوں

اگر بس چلے میرا سیماب تجھ پر
بسر عمر ساری تیرے سات کر لوں

(31جنوری1998ء منارہ)

○

کل کی باتیں کل کر لیں گے آج کی بات تو کر لینے دو
دیکھ تو لینے دو جی بھر کے آنکھوں میں بھر لینے دو

کارِ جہاں تو چلتا رہے گا ہم تم ہوں گے یا کوئی اور
گنتی کے لمحات ہیں باقی مل کے بسر کر لینے دو

ہم ہیں باسی اس کے نگر کے دِل بھی وہاں ہے جان وہیں
جسم تو ہے اِک خاک کی مٹھی اس کو کہیں گھر لینے دو

ساون' بادل' رت برکھا کی' گلشن' گل آباد رہیں
خار ہیں راہ میں سخت پیاسے ترِان کو کر لینے دو

کچھ تو زبانیں تیز ہوئی ہیں آدھی گنگ ہو جاتی ہیں
حال ہیں سب کے اپنے اپنے جو چاہیں کر لینے دو

آنکھوں پر الزام ہے سارا آنکھوں نے جگ دیکھا ہے
کس نے چُنا ہے ایک کسی کو یہ بھی طے کر لینے دو

ہو جائے سیماب سے بازی دیکھیں گے انجام کو ہم
جس نے جیت کے جینا سیکھا اس کو بھی ہر لینے دو

(22فروری1998ء۔لاہور)

○

چلنا تھی جو رقیب سے وہ چال چل گئے
ہم کو بلا کے گھر پہ وہ گھر سے نکل گئے

آنکھوں کو جھیل کہتے ہیں شاعر وفاؤں کی
لیکن نظر کے تیر تھے جو دِل پہ چل گئے

شکوے تھے، کچھ شکایتیں، کچھ آہ و زاریاں
لب تو نہ ہل سکے یہ سب اشکوں میں ڈھل گئے

ہم تھے رواں نقوش کف پا کو دیکھ کر
ان کا اشارہ کیا ملا راہیں بدل گئے

ان کا رخ جمیل تھا شیشے کی گود میں
دِل پر پڑی وہ چوٹ کہ آنسو نکل گئے

ملنا تو تھا نصیب پہ موقوف اے فقیر
ہم دو جہاں کو چھوڑ کے ملنے نکل گئے

(10فروری 1998ء لاہور)

(5مارچ 1998۔ گوجرہ)

انگلینڈ سے انگریزی میں آنے والے خط کا منظوم ترجمہ

چاروں طرف اندھیرا ہے
تاریکی نے گھیرا ہے

ہم کہاں جائیں حضرت جی!
کس کو بتائیں حضرت جی!

انساں جب گھبراتا ہے
پاس اپنوں کے آتا ہے

ہم پردیس میں بیٹھے ہیں
ہم کہاں جائیں حضرت جی!

ہم کہاں جائیں حضرت جی!
کس کو بتائیں حضرت جی!

بیوی رہتی ہے بیمار
جانا پڑے اگر بازار

چلی تو جاتی ہے ناچار
کرے شکایت لاکھوں بار

کیا سمجھائیں حضرت جی!
کس کو بتائیں حضرت جی!

بچیاں بچے سب ناکام
لڑنا بھڑنا صبح و شام

بھولیں سب اپنا انجام
اس سے قبل کہ ہوں بدنام

واپس لائیں حضرت جی!
کس کو بتائیں حضرت جی!

میری صحت، سخت خراب
چھوٹ گئی ہے میری جاب

بنک کا قرضہ اور حساب
اک کشتی لاکھوں گرداب

پار لگائیں حضرت جی!
کس کو بتائیں حضرت جی!

(12 فروری 1998ء۔ دار العرفان)

○

نہ مل مجھ سے نہ الفت کا صلہ دے
نہ لکھ نامہ نہ تو عہدِ وفا دے

محبت کی نہیں تھی ہو گئی تھی
بھلاؤں کس طرح اتنا بتا دے

بتایا تھا کبھی تو نے مجھے یہ
تو دِل کھولے تو دُنیا کو جلا دے

ترے دامن میں وہ برق تپاں ہے
جو قلب و ذہن کو شعلہ دکھا دے

کہاں ہے وہ تری اب بیقراری
وہ کیا افسوس جو شعلہ بجھا دے

سنا ہے آج کل تو خوش بہت ہے
مگر اتنا فقط اتنا بتا دے

بُھلائیں کس طرح وہ ساری یادیں
وہ منتر کیا ہے مجھ کو بھی سکھا دے

تو کیا تو نے محبت کی تھی مجھ سے
ہوئی تجھ کو نہیں تھی؟ یہ بتا دے

کہ ہے انسان کے بس میں ہمیشہ
بنائے خود عمارت خود گرا دے

بسائے نقش قدرت نے جو دِل میں
بھلا سیماب کیسے وہ مٹا دے!

(12 مارچ 1998ء موٹروے پر لاہور سے آتے ہوئے)

○

اَب تو ملے ہوئے بڑی مدت گزر گئی
پہلی تھی جو خطا وہی بے حال کر گئی

نظریں گھما کے دیکھنا اپنا قصور تھا
تصویر لے لی آنکھ نے دِل میں اتر گئی

اس نامراد دل پہ کبھی ہم کو ناز تھا
نازک سی اِک پری تھی جو پامال کر گئی

بے حال دل کا دیس ہے لیکن سنو تو دل
کہتا ہے وہ نظر مجھے خوشحال کر گئی

ڈالیں گے ڈاکہ اور اسے اٹھوا کے لائیں گے
تابِ جدائی جتنی تھی بے موت مر گئی

سیماب تم بتاؤ اگر راہ ہے کوئی
اپنی تو فکریں کھو گئیں اور عقل مر گئی

(23مارچ 1998ء "کشمور" سے "راجن پور" جاتے ہوئے)

○

بیتے ہوئے لمحات نہیں آتے پلٹ کر
لیکن ہیں بسے آنکھ میں سارے ہی سمٹ کر

ملنا تو مسرت کی علامت ہے جہاں میں
دِل یاد سے ملتا ہے تو روتا ہے لپٹ کر

آؤ تو کبھی تم کو بھی دکھلا تو سکوں میں
آباد ہے سینے میں جہاں ایک سمٹ کر

ہے بند کلی میں بھی چھپا درد کا احساس
کچھ بڑھ ہی گیا درد وہ غنچے میں اُلٹ کر

بٹتی تھی سر راہ ترے حسن کی خیرات
تھے ہم بھی وہیں بیٹھے مگر راہ سے ہٹ کر

جانے سے ترے ختم ہوا جشن بہاراں
گلشن میں اُڑی دھول ذرا دیکھ پلٹ کر

تم آؤ تو ہم بات جہاں بھر سے کریں گے
رکھ دیں گے زمانے کی روش کو بھی الٹ کر

یہ بات کہ ہم پا نہ سکے قرب تمہارا
لمحات وہ پر کیف تھے اس بات سے ہٹ کر

سیماب تمہیں کس نے کہا عشق کرو تم
اب روتے پھرو شہر میں ہر اک سے لپٹ کر

(یکم اپریل 1998ء کراچی)

○

ہے زلفِ گرہ گیر بھی اِک قید کا ساماں
اس قید میں کچھ اور ہی لذت ہے مری جاں

لے آئے کہاں گھیر کے افکار زمانہ
گرداب بلا دہر ہے ننھی سی مری جاں

دانش تو ملے کوچہ و بازار میں ہر جا
مل جائے کہیں تجھ کو جنوںؔ دیکھ مری جاں

دِل وصل کا طالب ہوا کیوں لب نہیں کھلتے
بچھڑے ہیں اسی جسم میں آپس میں دل و جاں

میں اُس کے لئے کرتا رہا اور دُعائیں
وہ لوٹ کے دل کو مرے کرتا رہا ویراں

ہاں مار کے پھینکا تھا یہ احساں تھا تمہارا
اب دیکھنے آئے ہو تو اِک اور ہے احساں

کیا خاک سمجھ پائے گا لیلیٰ کے اشارے
رُل جائے گا صحراؤں میں مجنون پریشاں

خاموش تھے خاموش ہیں' خاموش رہیں گے
بتلائے گا دنیا کو یہ درد دِل ویراں

احسان ہے سیماب پہ یادوں کا تمہاری
کٹتی ہے رفاقت میں سیہ رات مری جاں

(2اپریل1998ء جہاز میں کراچی سے اسلام آباد آتے ہوئے)

○

اے ساکنان قریہ دل آؤ تو کبھی
اشکوں کی رہبری میں رہ انتظار تک

سنتے ہیں فصل گل میں ملیں گے ضرور وہ
جیتا ہے کون دیکھیئے فصل بہار تک

اک سلسلہ شکست کا ہوتا گیا دراز
نظروں کی بے رخی سے دلوں کے قرار تک

آؤ کبھی تو لُوٹ کے لے جاؤ سارا گھر
جان و دِل خراب سے مشت غبار تک

ہم حسن بے مثال پہ کیسے نہ ہوں فدا
جس کی طلب میں پھرتے ہیں لیل و نہار تک

بجلی گری تھی طور پہ یہ بھی صحیح مگر
دیکھو کبھی اتر کے دل بیقرار تک

کیا مل سکیں گے قافلے سے تیرے ہم کبھی
بچھڑے ہیں ایسے کھو گیا رہ کا غبار تک

اس نے ترے جمال کو بدنام کر دیا
پہنچی جھلک یہ کیسی دل نابکار تک

تیرے لئے ہر ایک سے کرتے رہے ہیں پیار
چومے نہ صرف پھول ہی چومے ہیں خار تک

سیماب اپنے منہ سے یہ میں کس طرح کہوں
اس نے چھڑا کے رکھ دیا در سے دیار تک

(12اپریل1998ء لاہور سے ٹوبہ ٹیک سنگھ جاتے ہوئے)

○

شب کے پُر ہول سے سناٹوں سے جاں جاتی ہے
وصل کے لمحے بڑے دشمن جاں ہوتے ہیں

نرم پنچھی ہیں جہاں چاہیں بسیرا کر لیں
دِل کے باسی ہیں بھلا دور کہاں ہوتے ہیں

نہ مچا شور دِل زار دھڑکنا بس کر
کتنے ارمان ترے پاس پڑے سوتے ہیں

کتنے معصوم ہوا کرتے ہیں جذبے دل کے
اور یہ معشوق! یہ جذبوں سے سوا ہوتے ہیں

عشق اِک روگ ہے لگ جاتا ہے جاتے جاتے
اس کے بیمار تو راہوں میں پڑے ہوتے ہیں

کون جانے کہ غم عشق کا چرکا کیا ہے؟
بعد مرنے کے بھی یہ زخم ہرے ہوتے ہیں

گو تہہ خاک بھی جلنا ہے مقدر ان کا
لوگ کہتے ہیں کہ عشاق پڑے سوتے ہیں

جو گئے دنیا کے ہر کام سے دیکھو سیماب
یہ حقیقت ہے وہی کام کے لوگ ہوتے ہیں

(15اپریل1998ء دارالعرفان سے راولپنڈی جاتے ہوئے)

○

یہ کس طرح کا ہجر ہے کیسا وصال ہے
مرنا محال ہے کبھی جینا محال ہے

دنیا کو چھوڑ بیٹھے ہیں ہم آپ کے لئے
کہیے حضور آپ کا اَب کیا خیال ہے

یوں تو کسی کی یاد بھی تھی رات بھر رفیق
ایسی رفاقتوں کا سلیقہ کمال ہے

کہنے کو ایک بات ہے اچھی بہت مگر
ہو جائے گر تو پیار میں جینا محال ہے

رہنا وہ تیرا پاس بھی اور دور دور بھی
سوچیں اگر تو واقعی سچ مچ کمال ہے

اس دور نابکار نے چھینی ہیں اُلفتیں
اس دور کا تو فرد ہی شوریدہ حال ہے

اپنے ہی دِل کی آنکھ ہو روشن تو دیکھیے
بکھرا چمن میں ہر جگہ ان کا جمال ہے

اے ہجر تجھ سا کوئی بھی ساتھی نہ مل سکا
دیکھا ہے تیری دوستی بس بے مثال ہے

آئے تھے دیکھنے ہمیں لیکن حجاب میں
بولے ہوں ایک لفظ بھلا کیا مجال ہے

سیماب الٹی بات کو سوچو نہ اسقدر
ملنا محبتوں کا یہاں پر محال ہے

(21اپریل1998ء دارالعرفان)

○

کیا ہم نے کچھ بھی برا نہیں، ہوئی تم سے کوئی خطا نہیں
یہی اپنا اپنا خیال ہے ترا اور ہے، مرا اور ہے

کبھی ہم جفا کو کرم کہیں کبھی تم وفا کو خطا کہو
یہی اپنا اپنا کمال ہے ترا اور ہے، مرا اور ہے

ہمیں تم حسین لگے بہت، تمہیں ہم نظر نہیں آئے کچھ
یہی رنگ دید جمال ہے ترا اور ہے، مرا اور ہے

تجھے شکوہ ہم سے ہزار تھا' ہمیں اعتبار تھا آپ پر
یہ تو سوچنے کا وبال ہے ترا اور ہے مرا اور ہے

ترا ظلم کرنا شعار ہے یہاں. جان تجھ پہ نثار ہے
یہ عجب طرح کا وصال ہے ترا اور ہے' مرا اور ہے

ترے پاس وقت نظر نہیں یہاں اشکوں میں بھی اثر نہیں
شب و روز کا یہ جنجال ہے ترا اور ہے مرا اور ہے

کہیں آہو حسن اسیر ہے کوئی خالی ہاتھ فقیر ہے
یہ عجیب انوکھا سا جال ہے ترا اور ہے مرا اور ہے

ہے خزاں رسیدہ چمن کہیں رہیں شاد سرو و سمن کہیں
یہی موسموں کا کمال ہے ترا اور ہے' میرا اور ہے

یہ زمیں زمان بھی ایک ہے گویا سب جہان ہی ایک ہے
کوئی روتا کوئی نہال ہے ترا اور ہے مرا اور ہے

مجھے جستجو میں لگا دیا تجھے اس نے اپنا بنا لیا
ذرا دیکھ کیا یہ کمال ہے ترا اور ہے' مرا اور ہے

(17اپریل1998ءایبٹ آباد)

○

اے دل کبھی مجھ سے بھی کچھ بات کیا کرنا
اچھی یا بری جو بھی ہو ساتھ سنا کرنا

کس بات پہ غمگیں ہے؟ کس بات پہ افسردہ
جو بات چھپائی ہے وہ بات کیا کرنا

یوں جیتے جی مرنا بھی مر جانے سے کیا حاصل
گر موت مقابل ہو مر مر کے جیا کرنا

یہ دُکھ جسے کہتے ہیں، غم عشق جو ہوتا ہے
اس میں بھی تو لذت ہے یہ خوب پیا کرنا

کچھ زخم بھی لگتے ہیں، پھر خون بھی رستا ہے
یہ راہ شہادت ہے یاں خون دیا کرنا

اپنوں سے تو کیا پردہ، چھپ پاؤ گے تم کیسے؟
ہم کو ہے چھپانا کیا سب کھول دیا کرنا

ٹھہرو ذرا رک جاؤ ایسا کبھی مت کرنا
یہ انکی امانت ہے سینے میں سیا کرنا

ہاں کوئی اگر پوچھے مجبور تمہیں کر دے
کچھ اور حوالے سے تو بات کیا کرنا

سیماب اگر آئے یہ بات بتا دینا
غم کھانا ہے کام اپنا' تلخی کو پیا کرنا

(28اپریل1998ء جہاز میں کراچی سے لاہور آتے ہوئے)

○

دھوکا ہی دے کے جاتی ہے اب اپنی روح تک
اب کیا کسی کے جانے کا شکوہ کرے کوئی

آیا ہزار ناز سے تھا بن کے دِل کا راز
کس بے رخی سے جانے لگا کیا کرے کوئی

دِل زار کتنا سادہ ہے کرتا ہے اعتبار
جب بھی کہیں وہ پیار سے دیکھا کرے کوئی

ہم جانتے تھے دیتے ہیں دھوکا حسین لوگ
ہم چاہتے تھے ہم سے بھی دھوکا کرے کوئی

اے چاند تیرے حسن کو دیکھے جہان بھر
لیکن نہ میری آنکھ سے دیکھا کرے کوئی

گھر لے لیا ہے ہم نے بھی اِک اُن کے شہر میں
اَب آ کے اپنا حال تو پوچھا کرے کوئی

کیسی انوکھی آگ ہے' لذت ہے آگ میں
اے کاش مشت خاک کو شعلہ کرے کوئی

پھرتے ہیں خوار کوچہ و بازار میں فقیر
اَب آ کے اپنے بام پہ دیکھا کرے کوئی

(3 مئی 1998ء پنڈی جاتے ہوئے)

○

آئے تو تھے وہ ایک دن لیکن ہوئی عجیب بات
لمحے میں دن گزر گیا آیا نہ کچھ بھی اپنے ہاتھ

باتیں نہ دل کی کر سکا آنکھیں نہ سیر ہو سکیں
جانے وہ دن کہاں گیا ہجر کی تھی وہی رات

اِک چاند تھا طلوع ہوا روشن جہان ہو گیا
بادل کہیں سے آگیا وہ چاندنی کو دے کے مات

جانے یہ کیا نظام ہے اس کے نرالے رنگ ہیں
بنتی تو ہے کبھی کبھی بگڑے جہان بھر کی بات

لاتی ہے گھیر گھار کے اس کی روش قریب تر
لیکن کرے جدا انہیں ہاتھوں میں دیکھے جن کے ہاتھ

ہم بھی تو دھوکا کھا گئے اس کے کہے میں آگئے
سمجھے تھے عمر بھر کو اب پائیں گے ان کو اپنے ساتھ

لیکن زمانہ چل گیا اپنی ہی چال دیکھ لو
ایسے جدا کیا ہمیں جیسے نہ تھی یہ کوئی بات

اپنا تو یہ خیال ہے ہم کو ہیں وہ بھلا چکے
شاید ہوں وہ بھی قید میں گردش زماں کے ہات

آتی ہوں یاد سب انہیں بیتی ہوئی کہانیاں
شاید ہوں وہ بھی بیقرار' شاید کٹے نہ ان کی رات

کمزور سے خیال پر اب تو مدار زیست ہے
سیماب موڑ پر کسی شاید ملیں ہم ان کے ساتھ

(12 مئی 1998ء دارالعرفان)

○

باتیں تو بہت تھیں کہنے کی اے کاش میں ساری کہہ پاتا
اے کاش میں تجھ بن جی لیتا' اے کاش جدائی سہہ پاتا

کچھ بیتے دنوں کی یادیں ہیں اِک گزری شب کا افسانہ
آباد ہے یہ اک شہر حزیں اے کاش میں اس میں رہ پاتا

اِک دل تھا پرانا ساتھی تھا تو وہ بھی لے کر چلا گیا
گُن تیرے ہی وہ گاتا رہا پر پاس تو اپنے رہ پاتا

دُکھ اور بھی ہوتے ہیں جگ میں پر عشق کا روگ نرالا ہے
گرتی نہیں بجلی طور پہ گر وہ پانی بن کر بہہ پاتا

تم کو نہ سہی الفت ہم سے اک رسم جہاں بھی ہوتی ہے
محفل سے نہ جاتے یوں کچھ اپنا بھرم تو رہ جاتا

تم کہتے کہتے رُک بھی گئے کچھ کہہ بھی گئے سمجھا بھی گئے
اس وقت ہماری گر سنتے اشکوں کا دریا بہہ جاتا

تم کرتے جو رو جفا ہم پر تم ظلم جہاں بھر کے کرتے
پر رہتے سامنے نظروں کے دِل ساری کلفت سہہ جاتا

تھی ہم کو بہت امید کرم پر بات ہے شاید قسمت کی
گر قسمت موقع دے دیتی لب ساری باتیں کہہ جاتا

گو ہجر بھی ہے تو جاں لیوا ہیں وصل میں بھی طوفان کئی
گر رسم جہاں سے نہیں ڈرتا میں سب سے سب کچھ کہہ جاتا

سیماب کو دیکھا وقت نزع تھیں آنکھیں بند اور لب خاموش
گر سامنے اس دم تم ہوتے وہ دل کی باتیں کہہ جاتا

(19 مئی 1998ء کوئٹہ قیام کے دوران)

○

ہم کو حسن و عشق کا اب تک فسانہ یاد ہے
ساتھ تیرے جو گزارا وہ زمانہ یاد ہے

تھا کبھی ایسا بھی جب ہم نے تجھے دیکھا نہ تھا
وہ بہانے سے ترا ہر بار آنا یاد ہے

دیکھنا تجھ کو سمجھنا تیرے دل کی بات کو
اور پھر انجان سا بن بن کے جانا یاد ہے

وہ ملاقاتیں بدل کر ڈھل گئی تھیں عشق میں
اور پھر ہر بار ملنے کا بہانہ یاد ہے

وہ بلا لینا کبھی ہم کو وہاں اپنے حضور
یا کبھی پھر آپ کا وہ گھر پہ آنا یاد ہے

ہجر میں بھی دُکھ تو ہوتا ہے مگر وقت وصال
وہ تڑپنا آپ کا اور غل مچانا یاد ہے

وہ کنار راہ گزر جنگل میں مل کر بیٹھنا
رونا تیرا خود بھی اور ہم کو رلانا یاد ہے

وہ تیرا رو رو کے آخر چھوڑ جانا ایک دن
اور وہ چٹھی کہ اب پھر یاں نہ آنا یاد ہے

وہ تمہاری یاد میں ہر آن رہنا بیقرار
وہ ہمارا رات دن آنسو بہانا یاد ہے

لوگ اب سیماب کو سمجھے ہیں بے شک پارسا
باوجود اس کے ہمیں سارا فسانہ یاد ہے

(20 مئی 1998ء کو ئٹہ سے کراچی جاتے ہوئے جہاز میں)

○

تیری بے رخی کے باعث کوئی بھی مکاں نہیں ہے
پھروں میں تو ڈالی ڈالی مرا آشیاں نہیں ہے

ہمیں جان سے بھی جائیں نہ ہو علم تک کسی کو
یہ تو ظلم ہے سراسر کوئی امتحاں نہیں ہے

ترے سر پہ چتر شاہی تجھے ناز ہے اسی پر
ذرا دیکھ میرے سر پر کہیں آسماں نہیں ہے

مجھے تھا بھروسہ جس پر مرے دل کو اس نے لوٹا
اسے کیا بتانے جاؤں' کوئی راز داں نہیں ہے؟

چلے جائیں گے یہاں سے یہ جگہ بھی چھوڑ دیں گے
یہ تو بس تمہارا گھر ہے یہ مرا جہاں نہیں ہے

ذرا دیکھ تو ادھر بھی' میری بات کو تو سن لے
یہ ہے پانچ حرفی جملہ کوئی داستاں نہیں ہے

یہ تڑپ تڑپ کے میرا سر دار اس سے کہنا
میں لٹاتا وہ بھی تجھ پر مری اور جاں نہیں ہے

(28 مئی 1998ء لاہور سے آتے ہوئے موٹر

○

مانو جو مری بات تو اِک بات کہوں گا
ہے بات ہی ایسی کہ میں کہتا ہی رہوں گا

ہوتے ہو مرے پاس تو ہوتے ہو بہت دور
کب تک میں بھلا عالمِ نزع میں رہوں گا

ہر شاخ پہ اِک پھل بھی لگا کرتا ہے آخر
الفت کے شجر پر بھی ثمر لا کے رہوں گا

یہ دیکھنا اِک روز کہ خلوت میں تمہاری
سوچوں کی جگہ آ کے میں خود بیٹھ رہوں گا

بکھریں گے ترے گیسو مرے دوش پہ جس دن
اس دن میں ترے کان میں یہ بات کہوں گا

لگ جائے اگر آنکھ تو سیماب یہ جانو
آ جائے اگر موت تو مر کے بھی جیوں گا

(25جولائی 1998ء لاہور سے واپسی موٹروے پر)

○

جس بات کا چرچا ہے سر بزم رقیباں
وہ بات تو اس سارے فسانے میں نہیں ہے

ہم سے تو پھریں لاکھوں تری بزم کے طالب
تجھ سا تو کوئی سارے زمانے میں نہیں ہے

دِل پر جو لگے داغ تو وہ کیسے دکھائیں
ہے لطف چھپانے میں، دکھانے میں نہیں ہے

آنکھوں میں اتر کر ہی وہ پالیں گے حقیقت
جو بات ہے اس میں وہ بتانے میں نہیں ہے

وہ چہرے سے پڑھ لیں گے مرے دل کی کہانی
اک کیف سا اس میں ہے' سنانے میں نہیں ہے

آ جوڑ لیں پھر سے وہی ٹوٹا ہوا رشتہ
جو رنگ ہے جڑنے میں ہٹانے میں نہیں ہے

کچھ تم ہی کہو کیسے کٹیں ہجر کے لمحات
آجاؤ کبھی' لطف ستانے میں نہیں ہے

سیماب کی باتوں میں نہ آنا دل ناداں
پاگل کوئی اس سا بھی زمانے میں نہیں ہے

(19اگست 1998ء دارالعرفان)

○

کیوں اس قصے کو چھیڑا ہے؟ کیوں رات کی بات سناتے ہو
ہر رات تمہاری رات نہیں، ہر رات پیاری رات نہیں

تم آجاؤ تو رات کو بھی یوں پر جیسے لگ جاتے ہیں
ہوتے ہیں اکیلے جب بھی ہم تب کاٹے کٹتی رات نہیں

کچھ لوگ نرالے ہوتے ہیں بس دل ہی میں بس جاتے ہیں
بن دیکھے ان کے چین نہیں، بن بولے اُن کے بات نہیں

ہم دل نذرانہ دے بیٹھے اور اس کے سوا کچھ پاس نہ تھا
پر بات تو یہ بھی سچی ہے اس جیسی کوئی سوغات نہیں

کبھی مل کے گزارہ کرتے تھے دن رات کو ہم ویرانوں میں
کیا عجب قیامت گزری ہے اب ہوتی ان سے بات نہیں

جو درد کہ دل سے اٹھتا ہے وہ موتیوں میں ڈھل جاتا ہے
تب آنکھ برسنے لگتی ہے یہ موسم کی برسات نہیں

کبھی داغ دل جل اٹھتے ہیں پھر شعروں میں ڈھل جاتے ہیں
ہر لفظ میں دل کی دھڑکن ہے' یہ اتنی آساں بات نہیں

کل چلتے چلتے پوچھا تھا کیا آپ بھی ہم سے روٹھ گئے
وہ زیر لب مسکائے تھے نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں

سیماب کا سنتے رہتے ہیں کہتے ہیں بہت جی دار ہے وہ
کبھی وقت ملا تو دیکھیں گے' اپنی تو کچھ ملاقات نہیں

(6 ستمبر 1998ء۔ پشاور)

○

ہم نے تو اپنے دل کو ترا گھر بنا دیا
اے عشقِ ناتمام تو بدنام تو نہ کر

اے دل تری مراد ہے اپنی پہنچ سے دُور
ممکن نہ ہو جہاں میں جو وہ کام تو نہ کر

یہ حادثے ہیں سوچ کے کرتا نہیں کوئی
کھائی ہے چوٹ تو نے مرا نام تو نہ کر

کرنا ہو کوئی بات تو لیتا ہے ان کا نام
جو چاہے کر پہ نام کو بدنام تو نہ کر

آنکھوں میں بند وصل کی راتوں کا کیف ہے
بادِ صبا تُو آ کے مجھے رام تو نہ کر

اس شب کی یاد کا نشہ اترا نہیں ابھی
مجھ کو اسیرِ بادہ گلفام تو نہ کر

سیماب خوفِ ہجر سے جلتا ہے خون تک
لمحاتِ وصل کو بھی مرے نام تو نہ کر

(15 ستمبر 1998ء لاہور سے واپسی پر)

○

پھر سے خط لکھتا ہوں قاصد کے لئے
کیا جواب آئے گا یہ معلوم ہے

حالِ دِل کہہ دیں گے ہم احباب سے
کون کیا فرمائے گا معلوم ہے

دِل نہ مانا ورنہ ہم کہتے تھے عشق
رنگ کیا کیا لائے گا معلوم ہے

پھیر کر رخ بے نیازی سے کہا
تو کہاں تک جائے گا معلوم ہے

لے گیا وہ بزم کی رنگینیاں
اب یہاں کون آئے گا معلوم ہے

داستانِ غم بھی سنتا جائے گا
اور کہتا جائے گا معلوم ہے

آنکھ گر برسے تو لگ جاتی ہے آنکھ
سارا گھر جل جائے گا معلوم ہے

خود کرے گا اہتمام بزم شب
خود ہی وہ شرمائے گا معلوم ہے

کس سے پوچھیں ہم دوائے دردِ دِل
کیا وہ کچھ کہہ پائے گا معلوم ہے

(4اکتوبر 1998ء موٹروے پر لاہور سے آتے ہوئے)

○

درد ہوتا ہے کسے روتا ہے کون
کس نے دُکھ جھیلے ہیں اور سوتا ہے کون

ہم تو سو جائیں گے تو خود ہی بتا
پاس آکر پھر ترے سوتا ہے کون

اُن سے ملنے پر بھلا کیا دُکھ تجھے
تُو ذرا یہ تو بتا ہوتا ہے کون

عشق کے سودے میں کیا سُود وزیاں
کس نے کیا پایا ہے اور کھوتا ہے کون

کون کرتا ہے وہاں گل پاشیاں
بے نشاں قبروں پہ پھر روتا ہے کون

لُوٹ کر دِل لے گیا سینے سے وہ
ایسے ویراں گھر میں اب ہوتا ہے کون

آنکھ نم ہوتی ہے کس کی یاد سے
بیج دُکھ کے دِل میں یوں بوتا ہے کون

تم نے کیوں سیماب گھر لُٹوا دیا
اِس طرح ویران اب ہوتا ہے کون

○

اکیلا ہوں تو کیا غم ہے اکیلی ہی تو دنیا ہے
وہی ہو گا ترے جانے سے جو ملنے سے پہلے تھا

بکھر جاتا ہے گل جب شاخ سے کر لو جُدا اس کو
نہیں ہوتا کبھی ویسا کہ جو کھلنے سے پہلے تھا

محبت اِک جنوں ہے چاک دامانی ہے خُو اس کی
یہ پھر جُڑتا نہیں ہرگز کہ جو سلنے سے پہلے تھا

ذرا جنبش سے پلکوں کی بدل جاتا ہے سب منظر
نہیں ملتا وہ نظارہ کہ جو ہلنے سے پہلے تھا

ترے ملنے سے کتنی بستیاں آباد ہیں دل میں
مرا دِل وہ نہیں ہے جو ترے ملنے سے پہلے تھا

عجب ہے نغمگی دل میں عجب پر کیف عالم ہے
سحر ٹوٹا خموشی کا جو تار ہلنے سے پہلے تھا

نہ ٹھکراؤ اسے سیماب دِل بھرا تو پھر بھرا
نہ پاؤ گے کبھی یکجا کہ جو ملنے سے پہلے تھا

(6 اکتوبر 1998ء دارالعرفان سے لاہور جاتے ہوئے موٹروے پر)

○

شبِ نم گزیدہ سے پوچھ لو دِل زار وجہ قرار کو
وہ شہید راہِ وفا بھی ہے وہ ترس گیا ہے جو پیار کو

دِل زار لُٹتا رہا مگر ہمیں کچھ خبر نہیں ہو سکی
کریں شکوہ گر تو کسے کہیں بتا آنکھ کو یا غبار کو

جو تڑپنے میں ملے کچھ سکوں ملے چوٹ کھانے میں جو مزہ
وہ جو زخم زخم طلب کرے رہے کون ان کے شمار کو

کبھی رہ گذار پہ پھول ہیں، کبھی خار حدِ نظر تلک
بھلا کیا خزاں سے کہے کوئی ذرا روک لے وہ بہار کو

نہیں زور آہ کا بھی ہمیں، کوئی ہے زبان لہو کی بھی
تری آستیں پہ جو جم گیا سنے کون اس کی پکار کو

لگے اتنے چرکے جہان میں دِل و جان زخمی سے ہو گئے
یہ تو سارے یاد کے پھول ہیں کہ جو اپنے بھی ہیں بہار کو

وہ جو ہم پہ گزری، گزر گئی ذرا دیکھ اس کا اثر ہے کیا
ہے تڑپ تمہارے تو نام میں وہ ترس گیا ہے قرار کو

(ستمبر 1998ء۔12.30 شب۔

○

چھیڑو نہ سرِ بزم نکل جائے نہ منّہ سے
وہ بات کہ بندہ ہوں ذرا اور طرح کا

وہ رات' ملاقات یہ سب کیسے بھلا دوں
یادوں کا تو جلتا ہے دِیا اور طرح کا

کی بات تو چہرے کو تھا چلمن میں چھپایا
کیا حُسن تھا پردے سے عیاں اور طرح کا

ہر ایک کو پایا ہے ترے حسن پہ شیدا
پوچھو تو کریں قصہ بیاں اور طرح کا

ہوتا ہے تری بزم میں مجنون بھی دانا
کچھ اور تھا جو' وہ تھا وہاں اور طرح کا

تھی لب پہ صدا قیمتِ دِل ایک نظر ہے
اور ہاتھ پہ سودا تھا دھرا اور طرح کا

دُکھ ہجر میں ہوتا ہے مگر جان لو اے دِل
دُکھ وصل میں ہوتا ہے ذرا اور طرح کا

جلتا ہے دِل زار تو شعلہ نہیں بنتا
اُٹھتا ہے مگر اِس سے دُھواں اور طرح کا

دِل کہتا ہے آجاؤ گے آخر کو تم اِک دِن
بس جائے گا اِک اور جہاں اور طرح کا

سیماب کے شعروں نے کئی رَنگ بکھیرے
تھا اس کا بھی اندازِ بیاں اور طرح کا

(14 ستمبر 1998ء پنڈی سے واپسی موٹروے پر)

آزاد غزل

اِک تم ہو کہ فرصت نہیں اِک لمحہ کی تم کو
اپنا تو وہی شوقِ ملاقات ہے اب تک

اِک عمر ہوئی روٹھ گیا ابر بہاراں
کیوں دِل پہ وہی پہلی سی برسات ہے اب تک

ٹھکرا تو چکا بارہا وہ جذبہ دِل کو
کیا جذبہ ہے یہ ویسا ہی بے باک ہے اب تک

ہاں تجھ کو بھلانے کی سعی میں نے بہت کی
حاصل تو وہی دیدہ نمناک ہے اب تک

جس چاند نے جنگل میں ہمیں دیکھا تھا اس شب
وہ چاند بھی تو بر سر افلاک ہے اب تک

آؤ تو گلستاں میں وہی گوشہ بسا لیں
تنہائی کے نالوں سے جو نمناک ہے اب تک

افسانہ غم اس کو سنا دوں گا میں شاید
سیماب ہے اِک جس سے ملاقات ہے اب تک

(21 ستمبر 1998ء۔ دار العرفان)

جہان محبت

صدیوں تک بادل جھومیں گے اور ہو گی برسات
آتے جاتے رہیں گے بے شک صدیوں دن اور رات
کھلتے رہیں گے پھول ہمیشہ مہکیں گے گلشن
پھر وارد پت جھڑ بھی ہو گی دِل ہوں گے ناشاد

غربت' دولت' شہرت' عزت اور ذلت کی بات
رہے گی چلتی اس دنیا میں جیسے دن اور رات

ہر سورج کا حال انوکھا صبح، دوپہر اور شام
ہر اک شے ہے فانی جگ میں رہے گا اُس کا نام

وہ کہ چیز فنا سے بالا موت سے کوسوں دُور
روشن روشن راہیں اُس کی ہر کوچہ ہے طُور

شاہوں کا یہ شغل نہیں ہے نہیں فقیر کا کام
یہ تو کر دی ہے مالک نے ہر بندے کے نام

یہی عبادت، یہی عقیدہ اور ہے دین دھرم
یہی محبت، عشق اور مستی، الفت اس کا نام

اس دنیا میں اُس عالم میں صرف محبت ہے
ہر اِک شے اِک حد کے اندر یہ بھی حقیقت ہے

اس سے روشن دل ہوتے ہیں شہر اور قوم آباد
اگر محبت رخصت ہو گئی ہر اِک شے برباد

نفرت کے طوفان اُٹھیں گے جلتے شعلے' آگ
سب کچھ جل جانے سے پہلے جاگ مسافر جاگ

اگر محبت پالی تونے سب کچھ تُونے پایا
دین' دیانت' امن' شرافت سب دامن میں آیا

دُنیا میں دُنیا بھی پالی ساتھ میں پالی عقبیٰ
عزت' شہرت سب دامن میں ہے جو والی عقبیٰ

جس نے الفت کھودی دِل سے رہے نہ دل بھی خالی
اُس نے اپنے ہی دامن میں نفرت آگ جلا لی

پھر نفرت سے گھر جلتا ہے جل جاتے ہیں دیس
ساری خوشیاں کھو جاتی ہیں بدل کے اپنا بھیس

نفرت کو گر چھوڑ سکے تو کر لے اتنا کام
از خود عشق نصیب جو ہو تو لے کے اس کا نام

میٹھا میٹھا درد ہو دل میں نور کی ہو برسات
پھوٹیں ندیاں چشمے دِل سے پھولوں کی بہتات

تب کہہ دوں سیماب سے آجا دیکھ چمن دلشاد
تیرا ساتھ نصیب ہو جائے ہر گوشہ آباد

(25 ستمبر 1998ء خان پور کٹورہ)

○

میں فقط تیرا ہوں تو یہ بھی ذرا سوچ آخر
ہے ملاقات کسی سے تو بڑی بات نہیں

ظلمت شب بھی بڑے کام کی شے ہے آخر
شکوہ لوگوں کو ہے اس سے تو کوئی بات نہیں

دردِ ہجراں کو دیا ہے شب ہجراں کا نام
اس کے دامن میں بھی کیا وصل کے لمحات نہیں

کتنے سالوں سے بھلا روٹھ کے بیٹھے ہو تم
بھول جانا تو مرے بس کی کوئی بات نہیں

ہاں طلب میں ہی تو جی سکتا ہے طالب ہر دم
موت اس راہ میں آئے تو بری بات نہیں

عرش کی حد پہ چلا جائے گا انساں بے شک
چاہیے ساتھی کوئی تاروں کی بارات نہیں

بھول جاؤں گا وہ شامیں جو ترے ساتھ کٹیں
سب بھلا دوں گا مگر پہلی ملاقات نہیں

کس نے رسوائی کا سامان کیا ہے ہمدم
جس کی اس راہ پہ چلنے کی بھی اوقات نہیں

اب چلے آؤ کہ ہو جینے کا احساس کوئی
کس لئے جیتا رہوں ایسی کوئی بات نہیں

دیکھا سیماب کو ہر حال تڑپتے دیکھا
میں نہیں، شام نہیں، دن نہیں اور، رات نہیں

(26 ستمبر 1998ء حاصلپورہ بورے والا شب 11 بجے مکمل ہوئی)

○

پھر آئی بہاراں ذرا مجنوں کو صدا دو
بے تاب ہیں پروانے کوئی شمع جلا دو

پھر بزم میں ہوں گے یہاں عشاق کے چرچے
غیروں کے طلبگار کو محفل سے اٹھا دو

آؤ کہ درِ یار سے آتی ہیں صدائیں
گر وصل کے طالب ہو تو مقتل کو سجا دو

جو خون ابلتا ہے رگِ جان کے اندر
اِس خون کو محبوب کے قدموں پہ لُٹا دو

کٹ جاؤ مگر پاؤں میں لغزش نہیں آئے
جاں ہار کے پھر قوم کی قسمت کو جگا دو

کٹتا ہے گلو مسلم مظلوم کا ہر جا
اترو سر میدان یہ سب ظلم مٹا دو

بارود کے اس ڈھیر پہ ہے کفر کی سرکار
ایماں کے شرارے سے اسے شعلہ دکھا دو

اس کی مٹی پہ کرو دین کو نافذ
یوں نام محمدؐ سے گلستان سجا دو

سیماب ہیں اس بات کے یہ دونوں سلیقے
عظمت یا شہادت ہی سے منزل کا پتہ دو

(27 ستمبر 1998ء عبدالحکیم اسٹیج پہ جلسہ کے دوران 9 بجے شب)

○

دیکھا انہیں تو ایسے لگا جیسے آج تک
اُن کے بنا حیات مکمل بنی نہ تھی

ہم کو یونہی اٹھا دیا دربان نے مگر
آئے بھی تھے نہ وہ ابھی محفل جمی نہ تھی

جانے وہ کیوں بخیل تھا اپنے جمال پر
اس کے یہاں تو حسن کی کوئی کمی نہ تھی

اس میں تو جیت ہار پہ تھا زندگی کا کھیل
کوئی نہ کھیل پتوں کا کوئی رمی نہ تھی

وہ آئے بھی خفا سے' تھے جاتے ہوئے خفا
کچھ بات اپنی اُن کے ہاں شاید جمی نہ تھی

پینے کا کیا مزہ تھا کہ جب سامنے نہ تھے
مے خانے میں شراب کی کوئی کمی نہ تھی

جینے کے ہاتھوں مرتے رہے ہم تو عمر بھر
مر کے جو بات بنتی ہے اب تک بنی نہ تھی

اڑتی تھی گرد تا حدِ آسمان ہفت
لوح مزار پر مرے لیکن جمی نہ تھی

وہ چاہتے تو ڈھونڈنا مشکل نہ تھا مرا
یوں رابطوں کی دہر میں کوئی کمی نہ تھی

سیماب ساری بات کہو اُن سے ایک بار
قاصد بنا تا بات کیا اُس سے بنی نہ تھی

(10 نومبر 1998ء 10 بجے لاہور سے پنڈی موٹروے پر)

○

مرنے والوں سے کوئی یہ بھی کہے
مر کے جینا بھی تو مشکل کام ہے

جسم و جاں، عقل و خرد، قلب و نظر
پاس جو کچھ ہے تمہارے نام ہے

تُو نے کیا رُخ سے اٹھایا ہے نقاب
ہر گلی میں کیسا جشن عام ہے

مانگ تیری جستجو اور آرزو
حالِ دِل کا کیسا کیسا نام ہے

کون جانے کیسے جل بجھتا ہے دِل
یہ تو سب اِک جذبہ بے نام ہے

راستہ لمبا ہے منزل دور ہے
شوق تیرا تیز تر از گام ہے

مرزا' رانجھا' قیس اور فرہاد دیکھ
یہ نہ کہنا تُو ہی کیوں ناکام ہے

تھا مہینوال اس نگر میں بے اماں
عشق کا شاید یہی انجام ہے

ہار کر جیتا ہے جو جیتا یہاں
ہارنا دِل کا نرالا کام ہے

تم کہو سیماب جی شاید سُنے
نام اپنا تو بہت بدنام ہے

(10 نومبر 1998ء لاہور سے پنڈی موٹروے پر)

○

ہم بہک جاتے جنوں میں کیا خبر
آپ نے روکا ہمیں اچھا کیا

داستانِ شب تھی لب تک آگئی
آپ نے ٹوکا ہمیں اچھا کیا

کون کس کو یاد رکھتا ہے یہاں
آپ نے سوچا ہمیں اچھا کیا

ڈوب جاتے جھیل سی آنکھوں میں ہم
جس نے بھی روکا ہمیں اچھا کیا

کیوں کیا اِک بے وفا پر اعتبار
جو دیا دھوکا ہمیں اچھا کیا

دردِ دل ہے جان و دِل سے بھی عزیز
تونے یہ سونپا ہمیں اچھا کیا

چوم کر رخسار اشکوں نے کہا
ہاں نہیں روکا ہمیں اچھا کیا

دو جہاں سیماب نے لُٹوا دیے
کوئی تو کہہ دو ہمیں اچھا کیا

(23نومبر1998ء دارالعرفان۔ چکوال)

پاگل

کون پاگل ہے کیسا ہے پایا
بعد مدت کے یہ سمجھ آیا

وہ جو دانا تھا شہر میں مشہور
جس نے کاٹی تھی زندگی بھرپور

کتنے شعبوں میں کام کرتا تھا
صبح کو کیسے شام کرتا تھا

گھر ہو' دفتر ہو یا خدا کا گھر
دیکھا جاتا تھا ہر کسی جا پر

کھیت کھلیان میں نظر آتا
اس جگہ بھی وہ کام پر آتا

نفسا نفسی کے اس زمانے میں
کتنے لوگوں کے کام آنے میں

کتنے شعبے بنا رہا تھا وہ
ملک بھر میں چلا رہا تھا وہ

علم حاضر کا خوب تر شعبہ
اس کا اپنا تھا یہ مگر شعبہ

دین حق سے ملا دیا اس کو
اس نے پارس بنا دیا اُس کو

اِک سلیقہ ہی خوب تر ڈالا
وضع کیسا نصاب کر ڈالا

تھا معیشت میں بھی عمل اس کو
جیسے آتا تھا اس کا حل اس کو

اِک طریقہ عجب نکالا تھا
دِین میں اس نے سب کو ڈھالا تھا

کتنے لوگوں سے سود کا ناسور
کاٹ کر اس نے کر دیا تھا دور

دین حق بھی تو وہ سکھاتا تھا
کونے کونے میں جگ کے جاتا تھا

کتنی خوش رنگ بات کرتا تھا
دِل میں سامع کے وہ اترتا تھا

جتنی راہوں سے وہ گزر جاتا
ایک عالم کو زیر کر جاتا

پھر انوکھا سا اس کا جینا تھا
اس کے سینے میں بھی مدینہ تھا

اس کا دل تھا یا عشق باری تھا
سحر اِک سا جہاں پہ طاری تھا

اس کے سینے سے نور کی کرنیں
جس طرح ہوں حضور کی کرنیں

کتنے دل تھے جو یوں مچلتے تھے
اس کی دھڑکن کے ساتھ چلتے تھے

ایک سینے میں سو سمندر تھے
کتنے عالم جو اس کے اندر تھے

یہ سبھی کچھ تھا پر وہ انساں تھا
تیری طرح وہ جسم تھا جاں تھا

پیار وہ بھی کسی سے کر بیٹھا
کوا آخر منڈیر پر بیٹھا

پیار کا بدلا پیار بھی پایا
آخر اِک دن زمانہ در آیا

ہو گیا وہ جو پہلے ہوتا تھا
اٹھ کے راتوں کو وہ بھی روتا تھا

شان اس کی مگر نرالی تھی
سارے شعبوں میں جان ڈالی تھی

جب بھی دیکھو وہ مسکراتا تھا
کام ویسے ہی سب کے آتا تھا

جیسے دیکھو تو اس کو کچھ بھی نہیں
ہر گھڑی ضو فگن تھی اس کی جبیں

سخت جاں تھا وہ غم میں جیتا تھا
خون کے گھونٹ دِل میں پیتا تھا

گرد اس کے جہاں کا میلہ تھا
کتنے سالوں سے وہ اکیلا تھا

جس پہ مرتا تھا وہ تو چھوڑ گیا
عہد کرکے وہ سارے توڑ گیا

کتنے ہی برسوں کے تو بعد مگر
اس نے دیکھا عجیب سا منظر

ایک بندہ اسے نظر آیا
جیسے محبوب اس میں در آیا

پھر سے اس نے انوکھا کام کیا
بڑھ کے دامن کو اس کے تھام لیا

تُل گیا پھر سے پیار کرنے کو
جان اس پر نثار کرنے کو

میں نے دیکھا تو میں نے یہ جانا
میں نے پاگل کو آج پہچانا

عقل و دانش میں نام تھا اس کا
پاگلوں جیسا کام تھا اس کا

ایک عالم کا پیشوا تھا وہ
ایک بندے پہ پھر فدا تھا وہ

مرد آہن تھا عہدِ حاضر کا
اور نہ دنیا میں تھا کوئی ایسا

کرنے بیٹھا تھا پیار ہی آخر
نکلا مشت غبار ہی آخر

لوگ آخر بڑے سیانے ہیں
دیکھو سیماب ہی دوانے ہیں

(3دسمبر1998ءلاہور12بجے تا 1:25)

○

شبِ دراز کو آخر سحر بھی ہونا تھا
کبھی تو آہ میں اپنی اثر بھی ہونا تھا

جلا تھا میرا نشیمن جو اِک سر راہے
خبر نہیں تھی کہ وہ اپنا گھر بھی ہونا تھا

وفا کا قطرہ جو اس دِل کے سیپ میں اترا
اُسی کو ایک دن آخر گہر بھی ہونا تھا

بچا نہ دل تو بھلا اور کون بچ پاتا
شہید تیغ ستم اب جگر بھی ہونا تھا

جلا تھا میرا نشیمن جو اِک سر راہے
خبر نہیں تھی کہ وہ اپنا گھر بھی ہونا تھا

بہت سنبھال کے رکھا تھا جذبہ دِل کو
کہیں تو ایک دن اس کو نظر بھی ہونا تھا

وفا کا قطرہ جو اس دِل کے سیپ میں اترا
اُسی کو ایک دن آخر گہر بھی ہونا تھا

تم اعتراف شکست وفا ہی کر لیتے
کسی کو زیر کسی کو زبر بھی ہونا تھا

ثبات کس کو ہے دنیا میں دیکھ لے سیماب
دھواں دھواں ترے دل کا نگر بھی ہونا تھا

○

الفت کی تیری چھاؤں نے محفوظ کر دیا
دل کو دکھوں کی دھوپ سے، غم کے غبار سے

اغیار کے ستم سے جو مارے نہ جا سکے
مارے گئے وہ راہ محبت میں پیار سے

کس سادگی سے پوچھتے ہیں میرے دل کا حال
بوتے رہے سدا جو میری رہ میں خار سے

باتوں میں تیری آ گئے سچ جان کر انہیں
کرتا رہا تو پیار کے بھی کارو بار سے

چاہا ہے ہم نے ٹوٹ کے تجھ کو اے جان جاں!
تھکنے نہ پائیں گے کہیں ہم انتظار سے

ڈوبے گی ناؤ جس میں بھی کر دو ہمیں سوار
ہم سے نہیں ہمارے گناہوں کے بار سے

سمجھا چکے بہت مرا دل مانتا نہیں
آنکھیں پروتی رہتی ہیں اشکوں کے ہار سے

ہم کو نہ دے فریب کوئی اب کبھی فقیر
مارے ہوئے ہیں پہلے کے ہم اعتبار سے

(4 مئی 1997ء دار العرفان)